مجلّہ ہمایوں اور اقبالیات

عبدالرسول ارشد
ڈاکٹر عطاالرحمٰن میو

Mujla Humayun is a scholarly and research magazine with academic and literary tradition, in which articles related to Allama Iqbal's personality, poetry, thought and art have been published in different issues. This article provides a brief introduction to these published articles. The concepts and topics that have been published include the basic concepts of Allama Iqbal, Iqbal's philosophy of life, meetings with Allama Iqbal, Allama Iqbal's art of poetry, Rumi and Iqbal, important events of Allama Iqbal's life, Allama Iqbal's unpublished Writings, Iqbal's Concept of faqr, Comparative Study of Allama Iqbal with Nietzsche and Different thinkers, Mention of Reason and Love in Allama Iqbal's Poetry, Allama Iqbal and Nationalism, Philosophy of Iqbal and Plato, Painting and Iqbal's poetry, Iqbal's concept of love, good and evil in the eyes of Rumi and Iqbal, modern ghazal trends and Allama Iqbal's influence, Allama Iqbal and political science, comparative study of Allama Iqbal and Akbar Allahabadi, Iqbal's theory of art, Introduction to Iqbal's Masnavis, and Iqbal in Bargah Risalat.

مجلّہ ہمایوں میں علامہ اقبال کی شخصیت، فن اور شاعری پر کئی قابل قدر تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ مضمون نگار 'احضار حسین' نے مئی ۱۹۲۳ء کے شمارے میں ''علامہ اقبال'' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ مصنف نے علامہ اقبال کی بلندی خیال اور روشن دماغی کو تسلیم کیا ہے اور ان لوگوں کو جواب بھی دیے جنھوں نے ان کو سر کا خطاب ملنے پر اعتراض کیا ہے۔ علامہ اقبال کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوم کا کتنا درد رکھتے ہیں۔

محمد اکرام نے نومبر ۱۹۳۰ء کے شمارے میں 'اقبال کی مثنویاں' کے عنوان سے مضمون قلمبند کیا ہے۔ اس میں مصنف نے علامہ اقبال کی مثنویاں اسرار خودی اور رموز بیخودی کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اسرار خودی حقیقت سے کس درجہ زیادہ قریب ہے۔ ان مثنویوں نے فارسی شاعری میں خون زندگی دوڑا دیا۔ اس کے علاوہ اس علامہ اقبال اور دوسرے یورپین فلسفیوں کا مقابلہ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔

محمد حسین ایم۔ اے مئی ۱۹۲۲ء کے شمارے میں 'اسرار خودی' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ مصنف نے سب سے پہلے علامہ اقبال کا علم و ادب میں بلند مقام کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کی مثنوی اسرار خودی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو کہ آزادی کی کوشش ہے۔ اس میں انا کی تعلیم دی گئی ہے۔

مضمون نگار ممتاز حسن اکتوبر ۱۹۳۱ء کے شمارے میں 'اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں اس میں مصنف نے اقبال کو پیغمبر کہنے کی وجہ بیان کی ہے کہ انھوں نے زندگی کے بنیادی حقائق کو پیغام کی صورت میں لوگوں تک پہنچایا اور ایک راہ عمل کا انتخاب کیا ہے۔ اس کے بعد اقبال کی شخصیت اور اس کے فلسفہ اور کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال نے لوگوں کو ہوشیار ہونے، ملت کے ساتھ جڑے رہنے اور قومی نصیب العین کو ترقی دینے کی تلقین کی ہے۔ ان دیکھے خدا سے تعلق قائم کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> انسان کی بے قراری کو کم کرنے کے لیے قدرت نے اسے ایک اور قوت بخشی ہے جو مختلف اشیا کو ایک دوسری سے متمیز کرتی یا مطابقت دیتی ہے، ہمارے ذہنی معلومات اور نتائج کو یکجا کر کے انھیں ایک نظام کی صورت بخشی ہے اور انسان کو حفاظتِ زندگی اور سکون و عیش کو سبق سکھاتی ہے، یہ عقل ہے۔[1]

مصنف دوسری جگہ اس کا اظہار کرتے ہیں:

> جب حیات ملی اس درجہ محکم ہو جاتی ہے گویا ملت میں فرد کی طرح خودی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ خودی کی ابتدا فرد میں ہے اور انتہا ملت میں، ملت میں خودی کا احساس اسی صورت میں پیدا ہوتا اور قائم رہتا ہے جب اس کی روایات محفوظ رکھی جائیں۔[2]

اقبال کی زندگی سراپا عمل ہے۔ ان کی زندگی اصول حیات کے عین مطابق ہے۔ اقبال پر کی جانے والی کچھ تنقیدی غلطیوں کی مصنف نے نشاندہی کی ہے اور کہا کہ اقبال فقیر راہ نشین ہے اور انسانوں کو زندہ رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔

خواجہ عبدالسمیع اثر نے اپریل ۱۹۳۹ء کے شمارے میں 'اقبال کے چند بنیادی تصورات' کے عنوان

سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے مسئلہ ارتقا جو اقبال کے فلسفے کا اہم پہلو ہے کے بارے میں بیان کیا ہے۔ انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے علاوہ اسی قسم کے دوسرے سوالات کے جواب انتہائی خوبصورت انداز میں دیے ہیں۔ اس کا ثبوت جاوید نامہ کے کئی اشعار پیش کیے ہیں۔

ارشاد حسین بتائی نے جولائی ۱۹۳۶ء کے شمارے میں 'اقبال' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے علامہ اقبال کی اردو کا ایک بہترین شاعر قرار دیا ہے۔ مصنف نے اپنے اس دعوے کا ثبوت اردو شاعری کی مختصر تاریخ پیش کر کے دیا ہے۔ اقبال کی معنوی خوبیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ کلام اقبال کی اس خوبی کی وجہ سے قارئین اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک ان کو صرف اردو کا شاعر کہنا بھی مناسب نہیں ہے۔

افتخار الحق نے جون ۱۹۳۸ء کے شمارے میں 'مرحوم اقبال کی یاد میں' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے ایک نوعمر طالب علم کے اقبال کے بارے میں احترام کے جذبات کو بیان کیا ہے اس کے علاوہ اس مضمون میں اقبال کے کلام میں پائی جانے والی خوبیاں بھی بیان کی ہیں۔

بشیر احمد مارچ ۱۹۳۸ء کے شمارے میں 'اقبال' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف کی طرف سے شاعر مشرق علامہ اقبال کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ علامہ اقبال نہ صرف اعلیٰ پائے کے قومی شاعر ہیں بلکہ وہ ایک عظیم رہنما بھی ہیں۔ وہ ایسے شاعر ہیں جس کی بنیاد فلسفہ پر ہے اور وہ فلسہ جدوجہد اور عمل پیہم کا ہے اقبال کے کلام میں فطرت کی خوبصورتی کی بھی عکاسی کی گئی ہے اس سلسلے میں مصنف نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان میں اردو کی مثالیں فارسی کی مثالوں سے زیادہ ہیں۔

مضمون نگار جگن ناتھ آزاد مئی ۱۹۳۸ء کے شمارے میں 'اقبال کی منظر نگاری' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہیں اس مضمون میں مصنف لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی منظر نگاری ان کے کلام کا خاص موضوع نہیں ہے اور اقبال نے اسے متصور بالذات نہیں بنایا۔ مگر جہاں بھی ہے اس کا بیان سحر انگیز ہے۔ اس سلسلے میں مصنف علامہ اقبال کے فارسی اور اردو کلام سے مثالیں بھی پیش کرتا ہے۔

مضمون نگار اکبر حسین رضوی جنوری ۱۹۳۹ء کے شمارے میں 'علامہ اقبال سے ایک ملاقات' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے شاعر مشرق علامہ اقبال سے ایک ملاقات کو بیان کیا ہے۔ اور اس ملاقات کے بارے میں اپنے تاثرات بھی لکھے ہیں۔

مضمون نگار سعادت علی خان میر نے نومبر ۱۹۳۳ء کے شمارے میں 'اقبال کا ذوق استفہام' کے عنوان

سے مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں مصنف شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے ذوق استفہام کی وضاحت تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ اقبال ایک عظیم فلسفی اور مفکر تھے۔ علامہ صاحب کا فلسفہ اشیا کی حقیقت کا متجسس اور وجدان حقائق کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز سے سوال کر کے اپنے آگہی کی تسکین کرتے ہیں۔

مضمون نگار عاشق بٹالوی جنوری ۱۹۴۳ء کے شمارے میں 'علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے' کے عنوان سے ان چند دلچسپ واقعات کو بیان کیا ہے جو انھوں نے اردو کے عظیم شاعر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی صحبت میں حاصل کیے ہیں۔

مضمون نگار سید محمد عبداللہ مئی ۱۹۳۲ء کے شمارے میں 'اقبال اور سیاسیات' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں علامہ اقبال کے سیاسی تصورات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گی ہے۔ اقبال کے سیاسی تصورات کے پھلنے پھولنے میں حالات کا بہت بڑا کردار ہے اور اس طرح کہا جا سکتا ہے کی اس وقت کے حالات نے اقبال کی اس سلسلے میں بڑی مدد کی ہے ان کے فلسفہ سیاست کو بھی پروان چھڑانے میں مولانا روم کے فلسفہ کا بھی بڑا دخل ہے ان کے علاوہ انگریز فلسفیوں کا بھی اس میں بڑا اہم کردار ہے لیکن ان کی شاعری کا تعلق صرف خشک سیاست سے نہیں ہے بلکہ اس کی اشتہار باب حیات کے تاروں سے چھیڑ خانی بھی ہے یہ رباب حیات زمینی نہیں ہیں بلکہ آسمانی ہیں اور اقلیم روح کی تسخیر کرنے میں ان کا بڑا کردار ہے۔ مصنف نے ڈاکٹر علامہ اقبال کے فلسفہ سیاست کے مندرجہ ذیل اجزا بیان کیے ہیں:

۱۔ کامل سوسائٹی کی تکمیل
۲۔ اس سوسائٹی کے لیے ایک انسان کامل کی ضرورت
۳۔ ایک خالص اسلامی حکومت کا قیام
۴۔ جمہوریت کی خواہش اور مزدور کی حمایت۔ وغیرہ۔

مضمون نگار فیاض محمود سید دسمبر ۱۹۴۲ء کے شمارے میں ''اقبال کے کلام میں شیطان کا تصور'' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے اقبال کے کلام میں شیطان کے تصور کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ابلیس اور شیطان کے مفہوم میں کیا فرق پایا جاتا ہے اور وہ کون سے ادوار ہیں جن میں علامہ اقبال نے ان دو لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس بارے میں دوسرے سوالات کا جواب بھی اس مضمون میں موجود ہے۔ مصنف نے کلام اقبال کے کئی اشعار بھی مثال اور ثبوت کے طور پر پیش کیے ہیں۔

آدم کی تعمیر میں اگر عشق جزاعظم ہے مگر یہ عشق ابھی خدا آشنا تھا۔ ابلیس کے انکار سے ہل چل

پڑی۔ اس کا تکبر ایک قسم کا افہام ہے۔ اس کے تکبر سے انکار نہیں کیا۔ وہ تپش کا، خلش کا سوز کا مظہر ہے۔ زندگی کے خلاف نہیں۔ زندگی کو متنوع اور رنگین بناتا ہے۔ ابلیس کی شخصیت میں تخریب کا کوئی پہلو موجود نہیں وہ تعبیر کا اصول ہے۔ آدم نے حکم سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اس حالت میں نہ اسے استفسار کی جرأت ہو سکتی تھی اور نہ جستجو کی لیکن اقبال کے نزدیک ابلیس نے خدا کی حکم عدولی ضرور کی۔ مگر در پردہ اس نافرمانی میں ایک راز ہے۔ اقبال کے نزدیک ابلیس کے دو تصورات ہیں۔ ایک کی وجہ سے کائنات میں سوز اور تڑپ ہے اور دوسرا تاریکی، جہالت اور غلامی کی علامت ہے۔

مضمون نگار ایم۔ آئی۔ ملک مئی ۱۹۳۹ء کے شمارے میں 'علامہ اقبال کی شعر بخشی' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں صاحب مضمون نے علامہ اقبال کی ایک رباعی کا عکس چھپوایا ہے۔ علامہ اقبال نے یہ رباعی مولوی محمد ابراہیم کو بخش دی تھی۔ اس کے بعد اس رباعی کو اپنے کلام میں بھی نہ چھپوایا۔

مضمون نگار پروفیسر محمد اجمل نے نومبر ۱۹۴۳ء کے شمارے میں 'اقبال ایک ترقی پسند کی حیثیت سے' ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے ایک تنقیدی مضمون 'ہندوستان میں جدید اسلام' کا خلاصہ بھی بیان کیا ہے جو ایک انگریز نقاد پروفیسر ڈبلیو سمتھ نے لکھا۔ اس کے بعد اس مضمون پر مختصر سی تنقید بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر صاحب کے جن خیالات سے وہ اتفاق نہیں کرتے تھے ان کے خلاف اپنے دلائل بھی بیان کیے ہیں۔

مثلاً مسٹر سمتھ کہتا ہے پہلے مسلمان خدا کو مافوق الفطرت سمجھتے تھے مگر اقبال نے اسے کائنات کے رگ اور ریشے میں بتایا ہے کچھ ایسا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اقبال نے وضاحت سے اپنے نظریئے کو پیش نہیں کیا مگر یہ ضرور کہتا ہے کہ خدا لامحدود ہے وہ ہماری دنیا سے علیحدہ نہیں مگر ممتاز ہے خدا کو دیتا نہیں یہ درست ہے کہ اقبال، اشتراکت کو مادیت پرست فلسفہ سمجھتا تھا۔ مگر اتنی سی بات سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اقبال نے یہاں روح اور مادے کی دوئی کو صحیح جانا۔ سمتھ کہتا ہے کہ اقبال کو اقتدار کی اہمیت کا احساس شدید تھا مگر جزئیات پر بحث نہیں کی۔

مضمون نگار ملک محمد اکبر دسمبر ۱۹۴۳ء کے شمارے میں 'اقبال کے کلام میں بہشت و دوزخ کا تصور' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہیں۔ اس میں صاحب مضمون نے علامہ اقبال کے خودی کے تصور کے سلسلے کی نشو ونما اور ارتقا کو ازلی و ابدی ہی سمجھتے ہوئے دوزخ و بہشت کے اسلامی فلسفے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مضمون نگار نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قرآنی زبان پر حوالے دیتے ہوئے اس کی وضاحت کی ہے اس کے علاوہ شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

مضمون نگار اسد الحق ستمبر ۱۹۵۶ء کے شمارے میں 'اقبال کا فلسفہ حیات' کے عنوان سے مضمون لکھتے

ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے سب سے پہلے حیات کا مفہوم بیان کیا ہے اور اس کے بعد اقبال کا فلسفہ حیات پیش کیا ہے۔ مصنف نے ثبوت کے طور پر ان کے اشعار کے حوالے بھی دیے ہیں۔ مصنف کے نزدیک حیات ایک آگے بڑھنے والی اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی حرکت کا نام ہے یعنی زندگی کا مسافر جب ذوق سفر سے آشنا ہو جاتا ہے تو وہ اپنی کمر کسی جگہ نہیں کھولتا، ہر چشمے کا پانی پیتا ہے، ہر منظر پر نگاہیں ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

جمود اور تعطل، قیام اور آرام موت کا دوسرا نام ہے۔ دوسری جگہ مصنف لکھتے ہیں کہ تہذیب کسی طاقت پر غالب نہیں آتی بلکہ طاقت نے کئی تہذیبوں کو خس وخاک کی طرح اڑا دیا ہے اور یہ کہ یہ دنیا جہد بقا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

اب ذرا اس حقیقت پر نظر عمیق ڈالیے کہ جفا طلبی اور سخت کوشی کا مادہ ہم میں کہاں پیدا ہوتا ہے تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ جفا طلبی اور سخت کوشی کا مادہ ہم میں قوت وطاقت اور تاب وتوانائی کے وجود سے پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ ہم میں قوت وشوکت نہ ہوتو ہم خاک آلام ومصائب کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں گے؟ لہٰذا قوت وشکوت سے ہم میں جفا طلبی اور صعوبتوں کے جھیلنے کا مادہ پیدا ہوا اور اسی سخت کوشی کا دوسرا نام ہے۔[۳]

اصغر گونڈوی کہتے ہیں کہ:

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے

مضمون نگار اعجاز عبدالرحمان نے اپریل ۱۹۵۵ء کے شمارے میں 'اقبال ایک مصور کی نگاہ میں' کے عنوان سے مضمون لکھا اس مضمون میں مضمون نگار نے علامہ اقبال کی زندگی کے حالات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے اس کے علاوہ ان کی شاعری کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں۔ اقبال تمام تحریکوں سے واقف تھے وہ شخصیت کو انفرادیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے:

جہاں داری سے دشوار تر ہے کار جہاں بینی

اقبال مرد قلندر کے پاس جو بھی آتا جاتا وہاں ان کا جذب وسلوک سب کو اپنا گرویدہ بنالیتا۔ اقبال کے کلام میں سوز ہے، الفاظ کی تراکیب اور اشعار سے پتہ چلتا ہے وہ موسیقی اور مصوری سے ناواقف نہیں تھے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

سوز عشق از دانش حاضر مجو   کیف حق از جام ایں کافر مجو

دانش حاضر حجاب اکبراست   بت پرست و بت فروش و بت گراست

اقبال کے کلام میں سوز ہے جو شاعری کی جان ہے وہ شاعری کے علاوہ موسیقی بھی جانتا تھا اس کے الفاظ کی ترکیب اور انتخاب سے صاف ظاہر ہوتا ہے لیکن مصوری سے ناواقف تھا ورنہ خدا جانے اس کے کلام میں کیا جادو ہوتا ہمیں بچپن میں اس کی دو نظمیں بڑی پیاری لگتی تھیں بُلبل کی فریاد، پنجرے میں، اور ماں کا خواب، جوان ہوکر اس کے معنی سمجھے تو کورس میں سے نکالی جا چکی تھیں۔ اقبال نے جو کچھ لکھا خدا کے واسطے لکھا شاید اسی کا صلہ اسے وفات کے بعد شہرت کی شکل میں مل رہا ہے، ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے جس نے کہا ہے۔[۴]

مضمون نگار انتظار حسین اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارے میں 'اقبال کے یہاں قید خانہ' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ اس میں مضمون نگار نے بیان کیا ہے کہ تخلیق کار کے ہاں بعض اوقات پورا دور بھی قید خانہ کی طرح ہو جاتا ہے اور کبھی کبھار اظہار کے سانچے بیڑیوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح اقبال کے ہاں بھی قید خانہ کا تصور پایا جاتا ہے جس کا اظہار ان کی نظم 'معتمد کی فریاد' میں ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک مادے کو مادہ شکست نہیں دیتا اور نہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے بلکہ مادے کی تسخیر میں روح اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اقبال کے قید خانے کے تصور کے اظہار کے لیے صرف یہی ایک مصرع کافی ہے۔

اپنے لیے لامکاں میرے لیے چارسو!

اقبال نے ہر آرٹ کے بارے میں خاصا کچھ لکھا ہے جو اسے بہت کھینچتا ہے وہ تعمیرات ہے دوسری طرف تلوار ہے مسلمان قوم کی برتری کے بھی اس نے یہی دو پہلو نکالے ہیں فنون کی دنیا میں تعمیرات اور عمل کی دنیا میں شمشیر زنی نمونہ ملاحظہ کیجیے:

جامد فطرت میں یا یوں کہئے کہ فطرت کے اس حلقہ میں جسے جامد سمجھا جاتا رہا ہے دو مظاہر اقبال کو بہت کھینچتے ہیں پتھر اور لوہا یہ دو مظاہر اس کے لیے ایک Passion بن گئے ہیں۔ اس میلان کے ڈانڈے اس کے تسخیر فطرت کے تصور سے ملتے ہیں۔ جامد فطرت کی دنیا میں طاقت کے سب سے نمائندہ مظہر اسے یہی پتھر اور لوہا نظر آتے ہیں۔ وہ یوں سوچتا نظر آتا ہے کہ ان دو موذیوں کو گرالیا تو سمجھو کہ اندھے بے حس مادے کا پورا قلعہ فتح کیا۔[۵]

مضمون نگار بشیر احمد فروری ۱۹۵۰ء کے شمارے میں 'رومی اور اقبال' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں صاحب مضمون نے اقبال کے تصورات اور نظریات کو بیان کیا ہے اس میں مزید لکھتے ہیں کہ اقبال کو حضور کے بعد مولانا روم سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ وہ انھیں پیرومرشد کہتے تھے۔ اسکے لیے اقبال کے اشعار کو بھی حوالے کے طور پر بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اقبال ہی وہ پہلے فلسفی ہیں جو رومی کے خیالات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال کی شاعری کی بھی وضاحت اس میں

شامل ہے۔

مضمون نگار بشیر احمد جون ۱۹۵۰ء کے شمارے میں 'اقبال پاکستان کا شاعرفلسفی' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں اس میں انھوں نے کلام اقبال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبال کی عظمت کو بیان کیا ہے اور ان کے فلسفہ شاعری کے مفاہم تفصیل سے بیان کیے ہیں اور ان کی زندگی کے حالات کے بارے میں بھی بتایا ہے۔ ان کی خدمات اور تصانیف کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ان کے فن کو ان کی شاعری کا نصب العین، فلسفہ اور اسلام کے تصور کے حوالے سے بیان کیا ہے اور ساتھ ساتھ مقاصد بھی بتائے ہیں نیز حوالے کے طور پر اشعار بھی اس مضمون کا حصہ ہیں۔

مضمون نگار بشیر احمد نے مارچ ۱۹۵۱ء کے شمارے میں 'مولانا روم اور اقبال' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس میں صاحب مضمون نے مولانا رومی کے حالات زندگی بیان کیے ہیں اس کے علاوہ ان کی مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ شرف صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو حاصل ہوا ہے کہ رومی کی مثنوی کو پہلی مرتبہ وہاں لکھا اور پڑھا گیا۔ اس کے بعد بیسیوں ملکوں اور زبانوں میں ان کے کلام کو چھاپا گیا۔ اس کے بعد ان کی تصانیف اور سیرت کے بارے میں بھی بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ موجودہ دنیا کی رومانیت کی محتاج رہے گی اور دور حاضر میں اقبال نے جلال الدین رومی کے پیغام کو سمجھنے پرکھنے اور اس کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جاوید نامہ میں رومی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

مضمون نگار بشیر احمد نے جون ۱۹۵۱ء کے شمارے میں 'اقبال کا پیغام' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون/ مقالہ انقرہ یونیورسٹی میں ۱۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو منعقد ہونے والی یوم اقبال کی تقریب میں پڑھا گیا۔ یہ اقبال کی تیرھویں برسی کی تقریب تھی جس کا اہتمام ترکیہ پاکستان ثقافتی انجمن نے کیا تھا۔ مضمون نگار بشیر احمد نے اپریل ۱۹۵۳ء کے شمارے میں 'اقبال کی زندگی کے اہم واقعات' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے اقبال کی پیدائش، تعلیم، رہائش اور ان کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے۔ مضمون نگار بشیر احمد نے اپریل ۱۹۵۱ء کے شمارے میں 'علامہ اقبال کی دو نایاب تحریریں' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ صاحب مضمون نے علامہ اقبال کے دو خطوط ایک بنام محمد شاہ اور دوسرا بنام محمد بشیر احمد پیش کیے ہیں۔

مضمون نگار ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اپریل ۱۹۵۲ء کے شمارے میں 'اقبال کا نظریہ فن' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس میں مصنف نے اقبال کا نظریہ فن بیان کیا ہے۔ اقبال کا الہام کے بارے میں تصور پیش کیا ہے۔ اقبال نے اپنے نظام اخلاق کی بنیاد شخصیت پر رکھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اقبال اور ٹالسٹائی کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کے بعد اقبال اور آئی۔ اے رچرڈ کے نظریے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مضمون نگار جاوید اقبال نے اپریل ۱۹۵۲ء کے شمارے میں 'نطشے اور اقبال' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس میں مصنف نے نطشے کے افکار سے اقبال کے اثر قبول کرنے کے بارے میں لکھا ہے لیکن وہ اس کی نقالی نہیں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مضمون نگار نے اقبال اور نطشے کے نظریات پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے نظریات کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

نطشے جن اخلاقی اَوصاف کا مداح ہے وہ ایک امیر وکبیر، حد درجہ مدرک اور ظالم وجابر اقلیت ہی کو زیب دیتی ہیں۔ معمولی انسان جنھیں وہ ''خام اور ناتراشیدہ'' بتاتا ہے۔ صرف وفاداری اور اظہارِ خلوص کے لیے ہیں انھیں انفرادی مسرت یا خوش حالی کا حق نہیں پہنچتا اور عظیم انسان پیدا ہونے کے لیے مصائب برداشت کرنی پڑیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔[۶]

واضح ہوتا ہے کہ نطشے انسان کو ایک حیوانی وجود کے طور پر پیش کرتا ہے جبکہ اقبال اخلاقی وجود میں انا یا خودی کے ترفع کو مردِ کامل سے منسوب کرتا ہے اقبال کا مردِ کامل سفاکیت کی بجائے تکمیل خودی سے حیاتِ جاوداں کا حصول چاہتا ہے۔

مضمون نگار جلیل احمد قدوائی مئی ۱۹۵۱ء کے شمارے میں 'اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے بانگ درا کی قدیم اور جدید نظموں کے متن کے متعلق جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ قدیم متن کے بارے میں بیان کرنے کے لیے قدیم رسالوں اور کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی نظموں کے متن کے بارے میں پیش کی گئی مختلف باتوں میں سے بعض کی نفی بھی کی ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی نقل ہوئی نظموں اور ان کی بانگ درا میں شائع شدہ متن کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اپنے خیالات کا اظہار بھی اس میں کیا گیا ہے۔ ان میں پائی جانے والی تبدیلیوں کو نظموں کے عنوانات مثال کے طور پر سوامی رام ترتھ، صقلیہ وغیرہ سے اس کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔ ابر، چاند، دعا، خضر راہ، ترانہ ملی، پرندے کی فریاد سے ثبوت پیش کیے ہیں اور مصنف کے بقول نظم کی موجودہ شکل میں ایجاز اور جامعیت کی خوبیاں پائی جاتی ہیں لیکن شاعرانہ خوبیاں تفصیلات، اثر آفرینی اور زبان کے لحاظ سے خصوصاً جب نظم بچوں کے لیے اس کی ابتدائی شکل زیادہ مرغوب ہے۔

مضمون نگار زیڈ۔ اے حسین اسلام نے دسمبر ۱۹۴۵ء کے شمارے میں 'اقبال کی نظر میں عقل وعشق' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے یہ بیان کیا ہے کہ اقبال نے موجودہ تہذیب، سائنس اور عقل کو اپنے کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا درجہ دیا ہے۔ علامہ اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں لیکن عقل کو بھی زندگی کا لازمی جزو سمجھتے ہیں۔ اس کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کے دل

میں عشق و عقل کو ملا جلا دیکھنے کی خواہش ہے۔ جدید تہذیب وتمدن کا زیادہ میلان عقل پرستی پر ہے سائنس نے زندگی کو جذبات سے خالی کر کے، بالکل واقعاتی قسم کی زندگی میں تبدیل کر دیا ہے۔ مصنف کے بقول آج کل ہماری زندگی کے تمام بڑے بڑے اصولوں اور عقیدوں کی بنیاد عقلی استدلال اور سائنسی تجزیہ ہے اس میں نہ وحی والہام کی جگہ ہے نہ روحانیت اور اندرونی نفسیات کی۔ اس لیے آج کل ان دیکھے خدا پر ایمان لانا بھی ایک امر محال ہے۔ اقبال نے عشق کو زندگی کا سب سے بڑا محرک قرار دیا ہے جس سے ہر طرح کی رکاوٹوں پر غلبہ پایا جا سکتا ہے۔

مضمون نگار پروفیسر حمید احمد خان جنوری ۱۹۵۱ء کے شمارے میں 'اقبال کا شاعرانہ مقام' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اردو شاعری میں فنکار کے طور پر اقبال کا مقام کیا ہے اور اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور سے متعلق بھی انھوں نے لکھا ہے اور ایک فنکار کے طور پر اقبال نے اردو شاعری کی جو خدمت کی وہ یہ ہے کہ غزل کی ہیئت کو ایک ایسے مضمون سے آمیزش دی جسے اپنی ہزار سالہ تاریخ میں غزل نے قبول نہ کیا تھا۔ اقبال نے غزل کو عاشقی اور تصوف سے نکال کر بین الاقوامی معاملات اور سیاسیات کی طرف لے آئے۔ اس کے بعد مصنف نے اقبال کی شاعری کی خوبیاں اور ان کے اشعار بھی حوالے کے طور پر شامل کیے ہیں۔ اقبال اپنے خیالات کو منطقی تسلسل اور جذباتی ہم آہنگی موزوں ذریعہ اظہار کی تلاش رہی ہے۔ اقبال نے بطور ایک سخن ور یہ خدمت کی کہ غزل کی روش کو ایسے مضمون سے آمیزش دی جیسے غزل اس سے پہلے ہزار سالہ تاریخ میں کبھی انمول نہ ہو۔ اقبال کے انداز بیان میں شکوہ ہے انھوں نے ہمیشہ اس کے لیے حیرت انگیز طور پر کام کیا۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> اقبال نے بطور ایک سخن کار کے اردو شاعری کی سب سے پہلی خدمت یہ انجام دی کہ غزل کی ہیئت کو ایک ایسے مضمون سے آمیزش دی جسے غزل نے اس سے پہلے اپنی ہزار سالہ تاریخ میں کبھی قبول نہ کیا تھا۔ شروع میں غزل کا سرمایہ عشق و عاشقی کے موضوعات تھے پھر سنائی و عطار نے اپنے متصوفانہ مضامین کے لُطف سے آشنا کر کے اس عظیم الشان قدم آگے بڑھایا اقبال نے ایسی نوعیت کا ایک اور انقلاب بر پا کیا۔ یعنی عاشقی اور تصوف سے قطع نظر کر کے غزل کو بین الاقوامی معاملات وسیاست سے دوچار کیا۔[۷]

مضمون نگار پروفیسر حمید احمد خان اپریل ۱۹۵۳ء کے شمارے میں 'علامہ اقبال کے ہاں ایک رات' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے اقبال کی محفل میں شرکت کر کے اپنے مشاہدات اور تاثرات کو یاداشت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس ملاقات میں علامہ اقبال نے نہایت علمی انداز سے غالب اور بیدل کے تصورات پر روشنی ڈالی، اسلامی فنون لطیفہ پر محض فنِ تعمیر کو خالصتاً اسلام سے منسوب کیا۔ ہندو شاعروں میں سکون اور شانتی ہی غالب ہے سوائے رامائن کے کچھ حصوں کے، اس

بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

مضمون نگار رازی۔ ایف۔ ڈی نے اپریل ۱۹۴۷ء کے شمارے میں 'اقبال اور نیشنلزم' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے نیشنلزم کی تاریخ کو مختصر طور پر بیان کر کے اس کے نتائج کی سرخیاں بیان کی ہیں اور پھر چند سرخیاں اقبال اور قومیت، اقبال اور وصیت، مفکرین اور حکما کی آراء، اقبال اور ہندوستان، قائم کر کے اقبال کے خیالات اور جذبات کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح نیشنلزم مختلف ادوار میں چھایا رہا کروڑوں انسانوں کا خون بہایا گیا لاکھوں نذر آتش ہوئے تجارت و صنعت کو نقصان پہنچا۔ اقبال کا مسلک وحدت انسانی ہے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں اور یونانیوں کا بعد میں نسلی قرار پایا۔ اقبال کے بقول ان نظریات کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں وطن کو مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول کے طور پر اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> جہاں اقبال کے بیشمار مداح اور عقیدت مند موجود ہیں وہاں چند ایک نکتہ چین بھی ہیں ان نکتہ چینوں میں سے ایک گروہ ایسا ہے جس کو اقبال کے کلام میں تضاد نظر آتا ہے ان کے نزدیک ایک طرف تو اقبال آزادی کے گیت گاتا ہے حکمرانوں کی کمزوریاں گنواتا ہے۔ سلطنت کو اقوام غالب کی جادوگری سے تعبیر کرتا ہے ہندوستان کی غلامی کا رونا روتا ہے اور دوسری طرف وطنیت اور نیشنلزم (قومیت) کا مخالف ہے گہری نظر سے دیکھا جائے تو اقبال کے کلام میں کہیں بھی تضاد نہیں ہے بلکہ یہ نکتہ چین لوگوں کی اپنی ہی کوتاہ بینی اور کم نظری کا نتیجہ ہے۔[۸]

مضمون نگار رازی۔ ایف۔ ڈی اگست ۱۹۴۹ء کے شمارے میں 'اقبال کی شاعری میں مثالی نوجوانوں کا تصور' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے یہ بیان کیا ہے کہ قوموں کے عروج اور ترقی کا انحصار زیادہ تر نوجوان ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نوجوانوں کے بارے میں اقبال کے تصورات بیان کیے ہیں وہ نوجوانوں میں اخلاق حمیدہ اور پسندیدہ صفات دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اقبال نوجوانوں کو صرف ان کی کمزوریوں کے بارے میں نہیں بتاتے بلکہ اسلام کے ماضی کے بارے میں بتا کر اسلام کی تعلیمات اور روایات پر عمل کرنے کی نصیحت بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے اقبال کا عورت سے خطاب کا طریقہ بھی بیان کیا ہے اور مطلب سمجھانے کے لیے ان کے اشعار کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔ مسلمان نوجوانوں کو چونکہ فسطائیت، مادیت اور دہریت کے طوفانوں نے لپیٹ رکھا تھا بے عملی اور جمود عروج پر تھا اس تناظر میں وہ سمجھتے ہیں نوجوانوں میں روحانی امراض کا سبب مغربی تعلیم اور اسلام سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔ وہ نوجوناں میں قناعت جیسی خوبی چاہتے تھے دل مرتضٰی اور سوز صدیق کے خواہاں

تھے۔نمونہ ملاحظہ کیجیے:

اقبال کے نزدیک نوجوانوں کے لیے تن آسانی مہلک ترین امراض میں سے ہے۔مسلمان نوجوانوں کو اِس مرض میں مبتلا دیکھتے ہیں تو وہ خون کے آنسو روتے ہیں۔وہ ان میں عقابی روح پیدا کرنا چاہتے ہیں انھیں سخت کوش بنانا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں زندگی کی تلخیوں اور نامرادیوں کا علاج ہی سخت کوشی ہے۔[9]

مضمون نگار رشید احمد نے اگست ۱۹۵۱ء کے شمارے میں 'اقبال مجدد عصر' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔اس مضمون میں مصنف نے اقبال کی شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے ان کو مجدد عصر ثابت کیا ہے جس دور میں اقبال کی پیدائش ہوئی اور دنیائے اسلام کو جس طرح کے معاملات کا سامنا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ وہ خدا اور اس کے رسول سے عشق کی حد تک محبت کریں۔

مضمون نگار رفیع اللہ خان عنایتی نے جولائی ۱۹۵۱ء کے شمارے میں 'اقبال حضور رسالت میں' کے عنوان سے مضمون لکھا۔اس مضمون میں مصنف نے اقبال کی محبوب خدا نبی کریم سے عقیدت کو بیان کیا ہے اور ان اشعار کو بھی پیش کیا ہے جن سے اس عشق کا اظہار ہوتا ہے اس کے علاوہ انھوں نے بیان کیا ہے کہ اقبال سچے عاشق رسول تھے اور ہمیشہ ان کی محبت میں گرفتار رہے اور ان اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے جو انھوں نے بارگاہ رسالت مآب میں لکھے۔

مضمون نگار پروفیسر زینب صدیقی نے مارچ ۱۹۴۷ء کے شمارے میں 'اقبال خدا کے حضور میں' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔اس مضمون میں مصنف اقبال کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ پہلا شاعر ہے جس کا اکثر ذات باری سے خطاب رہا ہے۔اس سلسلے میں اقبال نے اپنی انا اور خودی کی حفاظت کو ہر موقع پر سامنے رکھا ہے اور ہمیشہ خلافت کی حدود کے اندر رہ کر کام کیا ہے۔ان کا خطاب مردمومن ہے۔کبھی وہ بےخوفی سے تقاضا کرتا ہے اور کبھی شوخی سے شکایت کرتا ہے۔مصرع پیش خدمت ہے:

ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

عموماً یہی ہوتا آیا ہے کہ حمد کا طرز یہی رہا جیسے بلیغ اور زوردار قصیدہ پیش کیا جا رہا ہو۔اقبال کی طرز یہ بھی کہ روزمرہ کے مسائل کا حل قرآن میں تلاش کیا۔اقبال کا جذب وشوق اس کو ساکن نہیں بنایا۔اس کا عرفان اس کو نفی ذات کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ حرکت اور ان تھک محنت پر اُبھارتا ہے اس کا شوق اس کی نوا کو عالم قدس پر پرواز کراتا ہے۔نمونہ ملاحظہ کیجیے:

غایت عشق ومحبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عاشق ومعشوق کے درمیان تکلف و بیگانگی کے تمام پردے چاک کر دے۔حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معاملہ میں غور کیجیے جب ان کا عشق حق الیقین سے عین الیقین

کے مرتبہ پر پہنچا تو بارگاہِ الٰہی سے خلیل کا لقب عطا ہوا یقین وایمان جوں جوں پختہ ہوتے جاتے ہیں توں توں انسان خلافت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتا جاتا ہے۔[۱۰]

مصنف نے خداوند تعالیٰ کی اہل دنیا کی مدح سرائیوں سے بے نیازی کا ذکر بھی کیا ہے۔

مضمون نگار پروفیسر سعید احمد رفیق نے نومبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں 'آزادی ارادہ اور اقبال' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے روسو، کانٹ، برگساں، جیمز اور ایڈنگٹن وغیرہ کے آزادی کے بارے میں نظریات کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اقبال کے نظریات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ مضمون نگار نے اقبال کے اشعار کو بھی وضاحت کے طور پر بیان کیا ہے۔ مابعد الطبعیاتی مفکرین کے خیال میں انسان کو آزاد اور بااختیار ثابت کرتے ہوئے اسے سیاسی اور اخلاقی طور پر آزاد نہ ثابت کرنا ناممکن ہے۔ روسو نے انسان کو خود مختار قرار دیا ہیوم مجبور محض کہتا تھا۔ کانٹ نے بااختیار کیا۔ نطشے نے بھی اختیاریت کا مسلک اختیار کیا۔ اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان طبعی حالات کا محکوم نہیں طبعی حالات اس کے محکوم ہیں۔ اقبال کے افکار کا سرچشمہ قرآن کریم ہے اقبال کے نزدیک زندگی بااختیار اور آزاد ہے۔ انسان جسمانی وروحانی اعتبار سے ایک قائم بالذات مرکز ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> غرض جیمز نے شعور کی شہادت پر ہی انسان کو بااختیار ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن اس شہادت کو تحلیل نفسی کے نظریات لاشعور اور تحت الشعور کی بنا پر پوری طرح قبول کرنے میں پس وپیش ہوسکتا ہے اس کے برعکس برگساں نے اس مسئلے پر بالکل مختلف زاوئے سے نظر ڈالی اور اختیار اور آزادی کو زندگی کا جوہر قرار دے کر اس مسئلہ کی نوعیت ہی بدل ڈالی۔ اس کے نزدیک وہ زندگی حقیقی معنوں میں زندگی ہی نہیں جو بااختیار اور آزاد نہ ہو۔[۱۱]

مضمون نگار شوکت سبزواری مئی ۱۹۴۵ء کے شمارے میں 'اقبال اور وطنیت' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف لکھتے ہیں کہ اقبال بیسویں صدی عیسوی کے اسلامی مفکر کے طور پر ابھرے۔ اس کے علاوہ اقبال کے ثقافتی اور تمدنی تصورات میں وطنیت اور مسئلہ وحدت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد قدیم زمانے میں وطن اور قوم کا مفہوم کیا تھا۔ اس بارے میں بھی بتایا ہے۔ اقبال اسلامی فلسفے کے جدید شارح ہیں۔ اقبال اپنے ابتدائی زمانہ میں وطنیت کے مبلغ تھے غالباً یورپ سے واپس آنے کے بعد جذبہ وطنیت کو خیر باد کہا اور وحدت اسلامیہ تبلیغ فرمائی بظاہر ان کی تعلیمات میں، وطن کا تصور وسیع پیمانے پر ہے کیونکہ وطن کا عمومی تصور نسل، جغرافیہ یا زبان ہوتا ہے اور مذہب ہے۔ مذہب سب سے زیادہ وسیع ہے۔ انھوں نے وطنیت کے عام تصور کے دائرے سے نکال کر مذہب کی بنیاد پر وسعت کا تصور دیا۔ وحدت اسلامی ایک بین الاقوامی نظام کا نام ہے جو اسلامی وحدت پر مشتمل ہے۔ جو حضرات اقبال کے وطنیت کے نظریہ کی تشریح کرتے ہیں جستہ جستہ اشعار کی تشریح کرتے ہیں اور نثر کو نظر انداز کر دیتے ہیں

اس طرح اقبال کے واضح سیاسی اور مذہبی تصورات کو دھندلا دیتے ہیں۔ مضمون نگار شوکت سبزواری نے مئی ۱۹۴۶ء کے شمارے میں 'رزام خیر وشر' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ رومی اور اقبال کے شیطان کے بارے میں نظریات تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اس مضمون میں رزم خیر وشر کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

مضمون نگار صابر حسین نے مارچ ۱۹۴۶ء کے شمارے میں 'اقبال کا فلسفہ عشق' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف لکھتے ہیں کہ اقبال کا فلسفہ عشق ایک بہت بڑی قوت محرکہ ہے۔ اقبال اور دوسرے اکابر کے نزدیک عقل وعشق دونوں قوموں کی زندگی میں ضروری ہیں۔ مردِ مؤمن کا عشق کا جذبہ، زوالِ مسلم، درمانِ زوال، اسلام اور عشق اسلام، اور عشق اسلام پیغامِ قرآن ہے۔ پھر سرخیاں قائم کر کے ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اقبال نے عشق کے لیے جذب اندروں جذب مسلمانی، طغیانی، مشتاقی اور جذبہ قلندرانہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اقبال کے خیال میں عشق زندگی کا جوہر ہے اس سے جذبات بلند ہوتے ہیں ادنیٰ اعلیٰ بنتا ہے یہ مردے کو زندہ کرتا ہے انسان کے افعال کی متحرک اس کی عقل نہیں بلکہ جذبہ ہے۔ مسلمانوں کی تمام ملکی اور تمدنی حالت کا ذمہ دار عشق اسلام کا جذبہ تھا مسلمانوں کا زوال عشق اسلام کی آگ سرد ہو جانے کی وجہ سے ہوا اقبال کے عشق کا فلسفہ چشمہ قرآن سے فیض یاب ہے۔ حضرت علامہ نے نکلسن کے نام ایک خط میں لفظ عشق کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

> خودی کی تعمیر عشق سے ہوتی ہے یہ لفظ نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں ضم کر لینے کی آرزو۔ اپنی بلند ترین صورت میں عشق کے معنی مخیلات اور اقدار کی تخلیق اور اُن کے حصول کی جدوجہد ہوتے ہیں۔[۱۴]

مضمون نگار صادق حسین ڈاکٹر ڈی لٹ نے اپریل ۱۹۵۰ء کے شمارے میں 'علامہ اقبال کا ایک مقالہ' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں موت کے بعد کی زندگی کے اسلامی نظریے کو سائنس کی جدید ترین تحقیق کی رو سے بالکل صحیح ثابت کیا ہے۔ اس مضمون کا اُردو میں ترجمہ بھی مضمون نگار نے پیش کیا ہے۔ نظریہ حیات بعد الموت مذہب کی تعلیمات کا ایک ایسا عنصر ہے جو سب سے زیادہ حیرت انگیز اور ناقابل یقین ہے اس میں اقبال نے مختلف قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے۔ یہی دلیل سائنس کی ہے کہ جس طرح پہلی دفعہ انسانی وجود کی اکائیاں یک جا ہو گئیں۔ اسی طرح اس کی موت کے بعد ایک بار پھر وہی جو یکجا ہو کر اس کی دوبارہ تخلیق کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال کا یہ مضمون ''دی مسلم روائیول'' (The Muslim Revival) بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حضرت مرحوم ومغفور نے حیات بعد الممات کے اسلامی نظریہ کو سائنس کی جدید ترین تحقیق وتدقیق کی رُو سے صحیح ثابت کیا ہے۔ نمونہ

ملاحظہ کیجیے:

جہاں تک میرے علم میں ہے ابھی تک اس مضمون کا اردو ترجمہ نہیں ہے اور شاید اس جواہر ریزے کو خزینہ اردو میں منتقل کرنے کی سعادت میں ہی حاصل کر رہا ہوں۔ اگر یہ مضمون حضرت علامہ مرحوم کے قلم سے نہ ہوتا تو بھی موضوع کے پیش نظر اس کی اہمیت کچھ کم نہ ہوتی لیکن علامہ اقبال کا مضمون ہونے کی وجہ سے اس کی افادی اہمیت اس بنا پر اور بھی زیادہ ہوگئی ہے اس سے ان اخلاقی اور روحانی قدروں کے متعلق اقبال کی شدتِ احساس اور فکری گہرائی کا پتا چلتا ہے جن کے وہ نقیب تھے اور جو ان کے پیغام کی جان ہیں۔[۱۳]

مضمون نگار صفیہ احمد نے اپریل ۱۹۵۰ء کے شمارے میں 'اقبال کا مردمؤمن' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے مردمؤمن کے نظریے کو بیان کیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ اقبال مردمؤمن کامل انسان کو گردانتے ہیں۔ اور انسان کی کاملیت ہی سے اس کی صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کی ذات تخلیقی اقدار کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ مزید اس مضمون میں مصنف نے اقبال کے مردمؤمن کی صفات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح حوالے کے طور پر اقبال کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ اقبال کے نزدیک مردِمومن کی پہچان یہ ہے کہ اس کی ذات میں جلالی اور جمالی صفات کی موزونیت ہو وہ سوز وساز زندگی کا رمز بنتا ہو مردمومن کی صفات کے بیان میں خودی پر زور دیتے ہیں زندگی ایک مسلسل حرکت ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

اقبال کا مردمومن اخلاقِ فاضلہ کا نمونہ ہے وہ اپنی زندگی میں اپنے عمل سے اعلیٰ عناصر کی تخلیق کرتا ہے اس کے برعکس نطشے کسی اخلاقی ضابطے کا قائل نہیں اس کے نزدیک مصاف زندگی میں نکوکاری کا کوئی مصرف نہیں، محض قوت درکار ہے جس سے کمزوروں پر غلبہ حاصل کر کے اقتدار پر قبضہ کیا جا سکے اقبال کا مردِ مومن اگرچہ جدوجہد سخت کوشش، اخطرات کے مقابلے اور مقاصد آفرینی سے اپنی خودی کی تکمیل کرتا ہے اور اس طرح عناصر قدرت پر قابو پاتا ہے۔[۱۴]

مضمون نگار طالب گورنچپن سنگھ نے جولائی ۱۹۴۶ء کے شمارے میں 'اقبال عالمِ بالا میں' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف اقبال کی عالم بالا کی سیر کو بیان کرتے ہیں۔ ایک بار اقبال نے اس عالم سے اُٹھ کر دوسرے عالم کی سیر کی۔ اس سیر کے دوران اُن پاک اور بلند روحوں سے فیض حاصل کیا جو دنیاوی کثافتوں سے نکل کر عالم بالا کی سیر میں مصروف ہیں۔ عالمِ بالا کی اس سیر کے دوران مولانا جلال الدین رومی کی روح نے ان کی رہنمائی کی۔

مضمون نگار طفیل دارا نے اپریل ۱۹۵۵ء کے شمارے میں 'اقبال اور عورت' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف لکھتے ہیں کہ اقبال انسان کی عظمت اور بزرگی کے بہت زیادہ قائل تھے۔

اقبال نے دیگر مخلوقات کے علاوہ مرد اور عورت کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ مصنف اس مضمون میں اقبال کے عورت کے متعلق خیالات و نظریات بیان کیے ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اقبال نے عورت کا ذکر ہی بہت کم کیا ہے اگر کہا ہے تو بہت کم یا سرسری بات نہیں کر گزرتا اس کے فلسفہ سے جہاں مرد کو اتنا زیادہ فائدہ حاصل ہوا ہے اور ایک شاندار نظام حیات اس کے ہاتھ آ گیا ہے وہاں عورت اس سے بالکل محروم رہ گئی حالانکہ اقبال پر معاشرے کے لیے مرد و زن دونوں کو یکساں حق تھا۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ عورت اور مرد انسانی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں کیونکہ زندگی انسان پر سوار نہیں جس کو اسے اٹھا کے پھرنا ہے بلکہ انسان زندگی پر سوار ہے جو اس کا بوجھ اٹھانے اور اسے اس کی منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے مجبور ہے یہ ایک لطیف سا فرق ہے کیونکہ انسان اور زندگی کا رشتہ ایک دوسرے کا محتاج نہیں۔[۱۵]

مضمون نگار ظفر احسن آصف نے مارچ ۱۹۴۹ء کے شمارے میں 'اقبال کی شاعری میں ادب برائے زندگی' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں صاحب مضمون نے ادب برائے زندگی کو بیان کیا ہے۔ اقبال آرٹ کو زندگی کا خادم خیال کرتے ہیں۔ ان کی زیادہ تر شاعری روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لیے ہے۔ اقبال کے نزدیک اس آرٹ کا کوئی فائدہ نہیں ہے جو انسانی زندگی کو تقویت نہیں دیتا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ارسطو کے زمانے سے لے کر آج تک ارباب تحقیق آرٹ کی پرکھ کا کوئی ایسا نظریہ پیش نہیں کر سکے جو فنون لطیفہ کی حقیقت و ماہیت کی تشریح کے سلسلے میں ہر دور کے ناقد کے لیے مسلمہ اصول تنقید کا کام دے سکتا ہو۔ (اسی بنا پر نظریات کے اختلافات کی گتھیاں کبھی سلجھنے میں نہ آئیں بلکہ ان میں مزید اُلجھاؤ پیدا ہوتے چلے آ رہے ہیں۔) چنانچہ اقبال جیسے شاعر کے معاملہ میں ناقد مجبور ہے کہ ان کے آرٹ کا تجزیہ یا تو انھی کے نظریات کی روشنی میں کرے یا پھر ان نظریات کو باطل قرار دینے اور کھوکھلا ثابت کرنے کے لیے اپنے ادبی تاثرات کی ترجمانی کرے۔[۱۶]

اقبال اس بات کے آرزومند ہیں کہ سامع جذب و قوت کی کیفیات سے فطرت پر قابو پائے۔ اقبال کی نظمیں آرٹ کے نقطہ نظر سے اس قدر مکمل ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان کی نظر نے خود مشاہدہ حسن بنایا ان کی نظموں میں تشبیہوں کی ندرت، کمال مصوری، محاکات اور اعجاز تخیل کے نہایت عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ اقبال کا آرٹ کا نظریہ خود اس کے نظریہ حیات کی طرح واضح اور روشن ہے یہ فلسفہ اور منطق کی پابندیوں کو قبول نہیں کرتا اور صحیح شعریت کے لباس میں ظہور پذیر ہونا۔

مضمون نگار ظفر احسن آصف نے اگست ۱۹۵۰ء کے شمارے میں 'اقبال کا فقرِ غیور' کے عنوان سے

مضمون لکھا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ اقبال کے فقرِ غیور کو سمجھنے کے لیے اقبال نے زندگی اور دوسرے مسائل کے بارے میں کہی ہیں ان چیزوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ اقبال کے فقرِ غیور کو سمجھنے کے لیے اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیمات کے فکری پسِ منظر کا مطالعہ ضروری ہے۔ اقبال کا فقر یہ ہے کہ انسان خدا کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکائے۔ اس کے بعد اس سلسلے میں ان کے دوسرے نظریات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وضاحت کے لیے اشعار کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اہلِ مشرق کی انفرادیت ختم ہوگئی تقلیدِ غرب اور صوفی و ملا کی غلامی کے باعث جس تصوف نے رواج پایا اس کے ردِ عمل کے طور پر عصرِ جدید میں غفلت، خود پسندی اور مادیت ظہور پذیر ہوگئی۔ اقبال ان دونوں کے مخالف ہیں۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> اقبال ایک جذباتی شاعر کی طرح صرف عیوب ہی بے نقاب نہیں کرتے بلکہ اس بے حسی اور درویشی کی وجہ بھی بتاتے ہیں آرام طلبی، عیش پرستی اور کسی حد تک غلامی کے باعث مسلمانوں میں تقلید اور مغربیت پرستی کی عادت پیدا ہوگئی چنانچہ نئے دور میں جدید علوم، سیاسی نظریوں، اقتصاری تحریکوں کو ہمارے پرانے حاکموں کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہم نے ان کے حسن و قبیح پر غور کیے بغیر انھیں قبول کر کے اپنا لیا۔[۲۷]

مضمون نگار عبادت بریلوی نے اپریل ۱۹۵۳ء کے شمارے میں 'اقبال اور غزل کے جدید میلانات' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے غزل کے جدید رجحانات کے سلسلے میں غالب، حالی، اکبر، چکبست اور اقبال کی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اقبال نے حالی، غالب، اکبر، چکبست کی قائم کی گئی روایات سے مستفید ہوئے اور غزل کو جدید رجحانات سے آشنا کیا۔

مضمون نگار عبادت بریلوی اپریل ۱۹۵۶ء کے شمارے میں 'اقبال کی لفظی پیکر تراشی' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے اقبال کی لفظی پیکر تراشی کو بیان کیا ہے اور مزید لکھتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کے فکری پہلو پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ ان کی فنی خصوصیات منظر سے غائب ہوگئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال مفکر ہونے سے پہلے ایک فنکار تھے۔ لفظی پیکر تراشی اقبال کی شاعری کی جان ہے اس کے علاوہ فکر اور فلسفے کو بھی ایک مستقل صورت مہیا کرتی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اقبال کی پیکر تراشی ان کے خاص ماحول اور اس ماحول کی مخصوص روایات اور ان روایات کے زیرِ سایہ پرورش پانے والے مخصوص مزاج کا نتیجہ ہے۔ اقبال کی پیکر تراشی وقت کے ساتھ آگے بڑھتی وہ بعض ایسی علامتیں تخلیق کرتے ہیں جو انھی کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہیں ان کی شاعری میں پیکر تراشی کے انقلابی نمونے ملتے ہیں۔

مضمون نگار عبدالحکیم خلیفہ نے اپریل ۱۹۲۵ء کے شمارے میں 'اقبال اور اخلاقی فلسفہ' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ مضمون نگار کے نزدیک انسان کی نظر باطن سے پہلے خارج پر پڑتی ہے اس کے بعد نظریہ

وجود پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یونانی فلسفے کے ساتھ افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو بھی بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اقبال اور افلاطون کے نظریات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ انسان کے پاس خارج کو سمجھنے کے لیے خود اپنے ہی نفع وضرر اور اپنی جبلتوں کے سانچے میں یونانی مفکرین ارتقا فکر میں رفتہ رفتہ تجسم سے تفکر کی طرف سے جسم سے نفس کی طرف یا خارج سے باطن کی طرف آتے گئے انھوں نے کشف مظاہر میں لطیف حقائق کا کھوج لگانا شروع کیا۔ فیثاغورث اور افلاطون وجود مطلق میں حرکت کے قائل نہیں تھے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو مادے سے نفس کی طرف آگے افلاطون کے نزدیک خدا جو تمام وجود کا ماخذ وہ بھی غیر متحرک اور غیر فاعل ہے۔ اقبال افلاطون کے اس نظریہ وجود کا مخالف تھا وہ اس کو سیاسی طور پر غلط قرار دیتا ہے ان کے خیال میں وجود کی حقیقت ایک انائے مطلق ہے جو خلاف ہے زندگی ایک مسلسل حرکت ہے اقبال کے ہاں زندگی مقدم ہے اور عقل موخر۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> یونانیوں کے پہلے مفکر طالیس ملطی (Thales of Miletus) نے کہا کہ وجود مطلق صرف پانی ہے پانی ہی ہر وجود کا جوہر ہے تمام ٹھوس چیزیں بھی پانی ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ اُس نے زندہ اور غیر زندہ میں یعنی جمادات نباتات اور حیوانات میں کوئی بنیادی فرق نہ سمجھا۔ زندگی کے تمام کوائف اور نفس کی تمام حالتیں بھی پانی ہی میں بالقویٰ اور بالفصل پائی جاتی ہیں۔[۱۸]

مضمون نگار سید عبدالواحد اجمیری نے جولائی ۱۹۴۵ء کے شمارے میں 'اقبال کے خطوط' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے اقبال کے خطوط کا ذکر کیا ہے۔ ان خطوط کے مطالعے کی اہمیت خصوصیات پر بھی نہایت مدبرانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ ادبی نقطہ نگاہ سے کلام اور فلسفہ کی تفہیم اور علامہ اقبال کی شخصیت پر ایک بصیرت افزا روشنی پڑتی ہے۔ اقبال کے مکاتیب میں برجستگی ہے بلاغت زبان ہے اس کی وجہ ان کا تبحر علمی ہے دقیق مسائل کو عام فہم انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان خطوط سے کلام اور فلسفے کے بعض حل طلب اور غیر واضح پہلوؤں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> اقبال کے یہاں اسی عشق وفقر کی شکل میں ہمیں زندگی کی بصارتیں اور بشارتیں ملتی ہیں اور وہ تمام اجزائے حیات دمکتے ہوئے نظر آتے ہیں جن سے ایک مکمل زندگی کے تصور کی تعمیر ہوتی ہے۔[۱۹]

مضمون نگار فلک پیما عبدالعزیز جنوری ۱۹۵۲ء کے شمارے میں 'اقبال کے چند اشعار' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے کلامِ اقبال سے اپنی پسند کے چند اشعار کا انتخاب کیا ہے اس کے بعد ان اشعار پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مضمون نگار فلک پیما عبدالعزیز نے اپریل ۱۹۵۵ء کے شمارے میں 'اقبال' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ ایک تقریر ہے جو ۱۲/اپریل ۱۹۴۸ء کو یوم اقبال پر کی گئی۔ اس میں شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ

اقبال کے اوصاف کو خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اقبال ایک حکیم، شاعر اور یکتا انسان تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اسلام پوری دنیا میں پھیل جائے۔ اس کے علاوہ اقبال کی نظموں کے اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں اور اس کے ساتھ اقبال کے خیالات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

دین حق از کافری رسوا تر است　　　زانکہ ملا مومن کافر گر است

مضمون نگار فہمیدہ قریشی نے اگست ۱۹۵۳ء کے شمارے میں 'اقبال اکبر کے نقشِ قدم پر' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف نے اقبال کی اکبر کے رنگ میں کی جانے والی ظریفانہ شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اقبال کی یہ شاعری ان کے مجموعہ کلام بانگِ درا کا حصہ ہے۔ اکبر نے جن مضامین کو تختہ مشق بنایا اقبال نے بھی ان ہی پر خامہ فرسائی کی ہے۔ مذہب، پردہ، تعلیم نسواں، تعلیم، مذہب وغیرہ کے مضامین اقبال کے ہاں بھی ملیں گے اور وہ جو مخصوص الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اقبال بھی کرتے ہیں۔ اکثر عربی، فارسی کے فقرے اشعار کے معنی کچھ کے کچھ بنا دیتے ہیں اقبال نے بھی یہی کوشش کی۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> ظرافت کے میدان میں بہتوں نے جولانیاں دکھائی ہیں لیکن اردو میں اکبر سا شہوار دوسرا نظر نہیں آتا بقول مرزا محمد عسکری ہر چند بہت سے لوگوں نے ان کی نقل کرنا چاہی لیکن صحیح معنوں میں کوئی ناقل نہ ہوا سب نقال ہی رہے۔[۲۰]

مضمون نگار سیّد محمد خان نومبر ۱۹۴۹ء کے شمارے میں 'اُردو شاعری میں اقبال کی انفرادیت' کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ اقبال اُردو زبان کا ایسا منفرد شاعر ہے جس کے کلام میں ربط اور نظم وضبط پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کی شاعری کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں اور حوالے طور پر اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ اقبال کا کلام ایک زمانے کی پیدائش ہے۔ تحریک پاکستان کے پس منظر میں ایک مسلم لیگ کی تحریک ہے اور دوسرا ذہنی اور فکری لحاظ سے اقبال کا کلام ہے۔ اقبال نے کوچہ عشق کے گم گشتوں کو نئی راہیں بتلائیں۔ اردو شعرا نے وصال کو ہی سب کچھ سمجھا اس کے برعکس اقبال کا محور ہمہ گیر ہے اقبال کے نزدیک وصل تمنا اور آرزو کی تسکین نہیں بلکہ ان کی موت ہے اقبال نے انسانی صلاحیتوں کا حقیقی تجزیہ کیا یہ راز بتایا کہ انسان اشرف الخلوقات ہے۔ اردو کے دوسرے شعرا نے ابلیس کو جنت سے نکالا ہوا فرشتہ سمجھا۔ اس میں کوئی خوبی نظر آئی نہ اور نہ ہی حرکت وعمل سمجھتے ہیں۔ اقبال نے جمالیات کا پورا حق ادا کیا اردو شاعری مزاج کے اعتبار سے فارسی ہی کی طرف مائل نظر آتی ہے لیکن اقبال کی شاعری عربی سے مناسبت رکھتی ہے عربی میں اور کلام اور خطابت زیادہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> اقبال نے انسان کی صلاحیتوں کا حقیقی تجزیہ کیا اور ریہ راز بتایا کہ وہ کیوں اشرف الخلوقات سمجھا جاتا ہے یہ

علم اشیا سے واقفیت کی وجہ ہے جس سے انسان ہمہ گیر صلاحیتوں اور قوتوں کا حامل بنا ہے۔ اگر چاہے تو انسان اپنی کوششوں اور صلاحیتوں سے دنیاوی واقعات اور حادثات پر قابو پا سکتا ہے اور فطرت کو بھی تصرف میں لا سکتا ہے۔[۲۱]

مضمون نگار مختار صدیقی دسمبر ۱۹۴۷ء کے شمارے میں ''جاوید نامہ پر ایک نظر'' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں اس مضمون میں مصنف نے آسمانی سیر کے تذکروں کو بیان کیا۔ پھر عارف ہندی کے جاوید نامہ پر بھی بحث کی ہے۔ اس بحث میں جاوید نامہ کا موضوع اور اس کا بنیادی مقصد شامل ہے۔ اس کے علاوہ جاوید نامہ کے کرداروں کا ذکر بھی کیا ہے۔

مضمون نگار مہر تصویر اپریل ۱۹۵۲ء کے شمارے میں 'اقبال کا فقر' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے انسانی عظمت کے بارے میں اقبال کے تصورات کو پیش کیا ہے اور اقبال سے پہلے کے شعرا کے زندگی کے متعلق نظریات کو بھی بیان کیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اقبال وہ واحد شاعر ہے جس نے زندگی کے رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ پھر اقبال کے عشق وفقر کی اصلاحات کی وضاحت پیش کی ہے اور لکھا ہے کہ اقبال سے پہلے عشق وخودی وفقر کے جو معجزات اور تصورات ہماری قوم میں رواج پا چکے تھے۔ اقبال نے ان تصورات سے ہٹ کر نئے تصورات سے لوگوں کو آگاہ کیا اور اقبال نے اس وقت رائج تصور فقر میں غیر اسلامی تصوف کو الگ کر کے لوگوں کو حقیقی اور زندہ فقر کے تصور سے واقفیت دلائی۔ مزید یہ کہ اس میں اقبال کے نظریہ فقر کو بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اقبال کا فقر درحقیقت مذہب اسلام کا بتایا ہوا فقر ہے بلکہ اقبال نے تو اسلام کا نام بھی فقر رکھ دیا ہے۔ اقبال فقر کو بے عملی اور ترک دنیا سے تعبیر نہیں کرتا۔

مضمون نگار وحید اعزاز نے اکتوبر ۱۹۴۹ء کے شمارے میں 'کلامِ اقبال کا ایک انگریز مترجم' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مصنف لکھتے ہیں کہ بلاشبہ اقبال کے مخاطب مسلمان ہیں۔ مگر اقبال نے پوری انسانیت کے لیے ایک پیغام چھوڑا ہے۔ اقبال کا شعری سرمایہ اردو اور فارسی زبانوں میں چھپا ہوا ہے۔ اقبال کی مشہور مثنوی اسرارِ خودی کا ترجمہ پروفیسر آر۔ اے نکلسن نے کیا اور شائع بھی کیا گیا۔ اس کو لوگوں نے بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کے بعد وی جی کیرنان اور بعض دوسرے انگریزوں نے بھی اقبال کی نظموں کے ترجمے کیے ہیں۔ مگر سب سے منظّم کوشش جو اس سلسلے میں کی گئی وہ انگریز مشترق اے جے آربری کی ہے۔ اس نے کلامِ اقبال کا انگریزی میں ترجمہ کر کے مغرب کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد مصنف نے ہری کی خدمات اور کلام اقبال کے ترجمہ کے سلسلے میں ان کی کوششوں کو بیان کیا ہے۔ اور اپنی تجاویز بھی کلامِ اقبال کے ترجمہ کے سلسلے میں پیش کی ہیں۔

مضمون نگار سیّد وقار عظیم نے اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارے میں 'اقبال کی شاعری میں لہجہ کی اہمیت' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں صاحب مضمون لکھتے ہیں کہ شعروادب میں اسلوب نگارش اور اندازِ فکر کے ساتھ ساتھ لہجے کے اتار چڑھاؤ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لہجہ مصنف کی شخصیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کی شاعری کا لہجہ حکیمانہ ہے کیونکہ وہ ایک بہت بڑے مفکر ہیں۔ مگر ان کے لہجے میں مختلف اوقات میں مختلف اثرات پائے جاتے ہیں۔ کہیں گداز، کہیں احساس کی شدت اور کہیں مقصد کے تقاضے پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے لہجے کی وضاحت کے لیے اقبال کی نظموں کے اشعار کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

جس طرح شاعر یا ادیب کے فکر وذکر کے انداز میں تغیر کی لہروں کا اٹھنا اور بڑھنا ایک فطری عمل ہے اسی طرح لہجہ کی تبدیلی بھی قدرتی سی چیز ہے فرق صرف یہ ہے کہ لہجہ کا تعلق چونکہ مصنف کی شخصیت سے بہت گہرا ہوتا ہے اس لئیے لہجہ میں یوں بظاہر کتنا ہی فرق پیدا ہو جائے لیکن آپ کے اس بنیادی انداز پر شخصیت کا پرتو غالب اور نمایاں رہتا ہے شخصیت کی لچک اس بات کی اجازت البتہ دے دیتی ہے کہ فن کار کے مختلف فنی کارنامے جن مخصوص حالات میں ظہور پذیر ہوئے ہیں ان کے اختلاف اور فرق کی جھلک لہجہ میں نمایاں ہو جائے۔[۲۲]

مضمون نگار سیّد وہاج الدین جون ۱۹۵۱ء کے شمارے میں 'انقرہ میں یومِ اقبال' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے اس انجمن کا ذکر کیا ہے جو انقرہ میں منعقد کی گئی۔

مضمون نگار کلیم سسرامی نے 'شکوہ اور جواب شکوہ' کے عنوان سے اپریل ۱۹۵۶ء میں مضمون لکھا۔ جس میں انھوں نے اقبال کی عظیم معرکہ آرا نظم کے بارے میں اپنے خیالات کو زیب قرطاس کیا۔ انھوں نے اقبال کی اس نظم کے خد و خال کو واضح کیا ہے اور اقبال کے خیالات کی وضاحت کو عوامی سطح پر لانے کی سعی کی ہے۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ میں اقبال نے مسلمانوں کی پستی کا شکوہ ربِ جلیل سے کیا ہے۔ جواب شکوہ میں ابھرنے کی ترتیب وترکیب جس انداز سے پیش کی گئی ہے وہ ان پر عطائے ربانی اور اس کی شان ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

شکوہ و جواب شکوہ، اقبال کی ذہنی بیداری کا نمایاں ثبوت ہیں اور مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی وجہ سے مذہبی تنزل اور اسلامی روایت و ثقافت کی پستی کا ردعمل! سر سید نے جو کام ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے کرنا چاہا اسے حالؔی نے ''مسدس حالی'' اور شکوہ ہند لکھ کر انجام دیا اور اقبال نے شکوہ و جواب شکوہ کی تصنیف سے مسلمانوں میں ذہنی بیداری اور ایمان کی پختگی کے ذریعے کرنا چاہا۔ بقول آل احمد سرور ان (اقبالؔ) کی وطنی شاعری حالی اور مخزن کی تحریک سے متاثر تھی ان کی اسلامی شاعری مسدس اور اکبر کے نشتروں نے ان کے فلسفہ اور مغربی تہذیب وتمدن کے مطالعے نے اس میں گہرائی، واقفیت اور ایک انوکھا پن ضرور پیدا کر دیا

تھا۔[۲۳]

مضمون نگار پروفیسر حمید احمد خان نے 'اقبال کی لفظی تصویر' کے عنوان سے ستمبر ۱۹۴۰ء کے شمارے میں مضمون قلمبند کیا ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے اقبال کے خدوخال، اُن کی شخصیت کا خاکہ، مزاج اور علم ورتبہ کو بیان کیا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان نے اقبال کے اندازِ گفتگو کو بھی شامل کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> محمدؐ اقبال! یہ نام پچھلی صدی تک کسی خاص مفہوم سے آشنا نہ تھا ہزاروں دوسرے ناموں کی طرح یہ بھی ایک نام تھا غیر متحرک اور منجمد جیسے زید اور بکر اور عمرو! آخر کار صدیوں کی بے سروسامانی کے بعد خود ہمارے عہد میں اس نام نے حیات جاوید کا خلعت پہنا کر اس کو زندہ کرنے کے لیے ایک مسیح آیا اور یہ نام علامت قرار پایا۔ فلسفہ زندگی کی ایک ہمہ گیر حرکت اور وسعت اور اضطراب کی آنے والی نسلیں اِس نام کے پیچھے صرف اسی حرکت، وسعت اور اضطراب کی جھپٹ دیکھیں گی۔[۲۴]

مضمون نگار اسلام 'اقبال کی نظر میں عقل اور عشق' دسمبر ۱۹۹۵ء کے شمارے میں شائع ہونے والے مضمون کو اقبال کے تصورات جو عقل اور عشق کے متعلق ہیں، کو زیر بحث لاتے ہیں۔ وہ اس میں بتاتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک عقل کا کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں تخلیق کرنے کے جذبہ کا فقدان ہے۔ اقبال کے ہاں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کا تصور موجود ہے اور اقبال عشق کو زندگی کا محرک سمجھتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> عقل ہماری روزمرہ کی زندگی کے مختلف مسائل سلجھانے میں مددگار تو ثابت ہوسکتی ہے لیکن جہاں ذہن کی اندرونی کیفیات کا تجزیہ مقصود ہو عقل بالکل ناکام رہتی ہے جن مسائل کا تعلق شعور اور احساس سے ہے وہاں عقل ایک عضو معطل بن کر رہ جاتی ہے عقل اسباب وعلل کی پیچیدگیوں میں کچھ ایسی پھنس جاتی ہے کہ وہ ہر چیز کو ادھوری اور نامکمل دیکھتی ہے۔[۲۵]

منتخب زیرِنظر مقالات میں اکثر و بیشتر مضامین کا جائزہ لینے بعد ان حقائق کی بناپر یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مجلّہ ہمایوں نے اقبال شناسی کے ضمن میں قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ علامہ کے افکار وخیالات کو نہایت مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ مجلّہ ہمایوں نے اقبالیات کے موضوع پر شائع ہونے والے مقالات کا انتخاب اس طرح کیا ہے جس میں اقبال کی شخصیت، شاعری، فلسفہ اور تعلیمات کے نئے پہلو منظرِعام پر آئے۔ اقبالیات شناسی میں مجلّہ ہمایوں کا کردار ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس سے فکر ونظر کے نئے چراغ روشن ہوئے ہیں اور گلستان اقبال میں رنگ رنگ کے ایسے گوشے مہک اٹھے جن کی خوشبو سے اہل ذوق نے استفادہ کیا۔

حوالہ جات وحواشی

۱- ممتاز حسن، ''اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے''، ہمایوں اکتوبر ۱۹۳۱ء
۲- ممتاز حسن، ''اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے''، ہمایوں اکتوبر ۱۹۳۱ء
۳- اسدالحق، ''اقبال کا فلسفہ حیات''، ہمایوں ستمبر ۱۹۵۶ء
۴- اعجاز عبدالرحمان، ''اقبال ایک مصور کی نگاہ میں''، ہمایوں اپریل ۱۹۵ء
۵- انتظار حسین، ''اقبال کے یہاں قید خانہ''، ہمایوں اپریل ۱۹۵۴ء
۶- جاوید اقبال، ''نطشے اور اقبال''، ہمایوں اپریل ۱۹۵۲ء
۷- حمید احمد خان پروفیسر، ''اقبال کا شاعرانہ مقام''، ہمایوں جنوری ۱۹۵۱ء
۸- رازی۔ ایف۔ ڈی، ''اقبال اور نیشنلزم''، ہمایوں اپریل ۱۹۴۷ء
۹- رازی۔ ایف۔ ڈی، ''اقبال کی شاعری میں مثالی نوجوانوں کا تصور''، ہمایوں اگست ۱۹۴۹ء
۱۰- زینب صدیقی پروفیسر، ''اقبال خدا کے حضور میں''، ہمایوں مارچ ۱۹۴۷ء
۱۱- سعید احمد رفیق پروفیسر، ''آزادی ادارہ اور اقبال''، ہمایوں نومبر ۱۹۵۰ء
۱۲- صابر حسین، ''اقبال کا فلسفہ عشق''، ہمایوں مارچ ۱۹۴۶ء
۱۳- صادق حسین ڈاکٹر ڈی لٹ، ''علامہ اقبال کا ایک مقالہ''، ہمایوں اپریل ۱۹۵۰ء
۱۴- صفیہ احمد، ''اقبال کا مردمومن''، ہمایوں اپریل ۱۹۵۰ء
۱۵- طفیل دارا، ''اقبال اور عورت''، ہمایوں اپریل ۱۹۵۵ء
۱۶- ظفر احسن آصف، ''اقبال کی شاعری میں ادب برائے زندگی''، ہمایوں مارچ ۱۹۴۹ء
۱۷- ظفر احسن آصف، ''اقبال کا فقرِ غیور''، ہمایوں اگست ۱۹۵۰ء
۱۸- عبدالحکیم خلیفہ، ''اقبال اور اخلاقی فلسفہ''، ہمایوں اپریل ۱۹۵۲ء
۱۹- عبدالواحد اجمیری سیّد، ''اقبال کے خطوط''، ہمایوں جولائی ۱۹۴۵ء
۲۰- فہمیدہ قریشی، ''اقبال اکبر کے نقشِ قدم پر''، ہمایوں اگست ۱۹۵۳ء
۲۱- محمد خان سیّد، ''اُردو شاعری میں اقبال کی انفرادیت''، ہمایوں نومبر ۱۹۴۹ء
۲۲- وقار عظیم سیّد، ''اقبال کی شاعری میں لہجہ کی اہمیت''، ہمایوں اپریل ۱۹۵۴ء
۲۳- کلیم سرامی، ''شکوہ اور جواب شکوہ''، ہمایوں اپریل ۱۹۵۶ء
۲۴- حمید احمد خان پروفیسر، ''اقبال کی لفظی تصویر''، ہمایوں ستمبر ۱۹۴۰ء
۲۵- اسلام، ''اقبال کی نظر میں عقل اور عشق''، ہمایوں دسمبر ۱۹۹۵ء